© rasailojaraid.com

مولانا عبدالرحمٰن کیلانی

(قسط ۱۲)

عجمی تصوّرات
کا دُوسرا دَور!

سمجھے آپ کہ سید صاحب اس معجزۂ قرآن کی آڑ میں کیا فرما رہے ہیں؟ وہ کہتے ہیں کہ:-

(۱) قرآن میں جو بیسیوں مقامات پر قصۂ آدم و ابلیس اور فرشتوں کا بیان ہوا ہے۔ تو اس سے مراد صرف فطرت انسانی کا سمجھانا مقصود تھا۔

(۲) فطرت انسانی کا سمجھانا بہت دقیق راز ہے۔ جو دُوسرے آسان الفاظ میں ادا ہو سکتا تھا۔ لہٰذا بار بار یہ قصہ دُہرا کر اہل دانش کو سمجھانا ضروری تھا۔

(۳) یہ راز اتنا دقیق ہے۔ جو عام لوگوں اور اُونٹ چرانے والے (صحابہ کرامؓ) کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

(۴) اور جن لوگوں نے اس راز کو دریافت کر لیا ہے۔ وہی عالم، دانشمند اور خاص لوگ ہوتے ہیں۔ جیسے سرسیّد اور اُن کے ہمنوا لوگ۔ (نعوذ باللہ من شرور انفسنا)۔

سیّد صاحب کے بعد میں آنے والے قرآنی مفکّر نے قصۂ ابلیس و آدم کی بعینہٖ یہی تاویلات ذرا تفصیل کے ساتھ پیش کی ہیں۔ البتّہ وہ جنّت، شجرِ ممنوعہ اور ہبوطِ آدم کی تاویلات میں سیّد صاحب سے اختلاف رکھتے ہیں۔ لہٰذا ان کا جائزہ ہم آگے چل کر "نظریۂ ارتقاء" میں بیان کریں گے۔

سرسیّد پر کفر کا فتویٰ:

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ آپ کے دل میں مسلمانوں کے لیے درد بھی تھا اور خلوص بھی یہ بھی حقیقت ہے کہ مسلمان قوم ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد حکمران انگریز طبقہ کی نظروں میں مجرم اور مقہور تھی۔ اور شاہ اسمٰعیل شہید کی تحریک نے انگریزوں کو اور بھی غضبناک بنا دیا تھا۔ ان حالات میں سیّد صاحب نے ان دونوں حلقوں کو قریب تر کرنے اور آپس میں مفاہمت کی فضا ہموار کی۔ اور ان کوششوں میں اپنی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جان اور مال تک کھپا دیا۔ لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلّم ہے کہ اس کشمکش میں خود آپ نے اور مسلمانوں نے جہاں کچھ مادی فوائد حاصل کیے وہاں ایک بہت بڑا نقصان یہ بھی پہنچا کہ آپ نے نہ صرف خود کو مغربی تہذیب و افکار کی جھولی میں ڈال دیا بلکہ مسلمانوں کو بھی اس راہ پر گامزن کر کے اسلام کے بنیادی تصورات اور ایمان بالغیب کی بیشتر کڑیوں کی جڑیں تک ہلا دیں۔ اور ہر ایسے واقعہ یا تصور پر دھاوا بول دیا، جو مغربی افکار و نظریات کی میزان پر پورا نہیں اترتا تھا۔ معجزات سے انکار یا ملائکہ، وحی، نبوت اور دوسرے کئی مسلمات سے متعلق ایک نئے تصور کی تخلیق اسی ذہنی شکست خوردگی کے نتائج و آثار ہیں۔ نتیجتاً مسلمانوں کے تمام فرقوں نے آپ کی اسی نیچریت کی بنا پر متفقہ طور پر ان پر کفر کا فتویٰ لگا دیا چنانچہ ادارہ "طلوعِ اسلام" اس فتویٰ پر یوں تبصرہ لکھتا ہے کہ:

"طرفہ تماشا یہ ہے کہ مختلف مذہبی فرقوں کے وہ اجارہ دار جو دین خدا کے کسی اصول پر کبھی متفق نہ ہو سکے اور ہمیشہ دوسرے فرقہ کو کافر سمجھا کئے۔ ان کا اجماع ہوتا ہے تو اس دیوانۂ ملت کی تکفیر پر جس نے کڑے اور نازک مرحلے پر پوری ملت کو موت سے بچا کر نئی زندگی عطا کی۔" (پاکستان کا معمارِ اوّل ص ۸۳)

اس تبصرہ میں کئی باتیں حقیقت کے خلاف ہیں۔ مثلاً:

۱۔ مسلمانوں کی اکثریت نے اصولوں میں آج تک اختلاف نہیں کیا۔ بلکہ اگر کوئی شخص اصولوں میں اختلاف کرے تو اکثر فرقے اپنے فروعی اختلاف کے باوجود اس کی تکفیر پر متحد ہو جاتے ہیں۔ مثلاً حسین بن منصور حلاج، یا مرزا غلام احمد قادیانی یا سر سید کی تکفیر پر۔ پھر یہ اتحاد صرف مسئلہ تکفیر پر ہی نہیں اور بھی بیشتر اجتماعی امور پر ہو جاتا ہے۔ مثلاً پاکستان کی تشکیل یا قرارداد مقاصد یا تحریک ختمِ نبوت یا نظامِ مصطفےٰ کے نفاذ پر مسلمانوں کے اکثر فرقوں میں فروعی اختلافات کے باوجود اصولوں پر بالعموم اتفاق ہو جاتا رہا ہے۔

۲۔ مسلمانوں کے فرقوں نے فروعی اختلافات کی بنا پر کبھی ایک دوسرے کی تکفیر نہیں کی۔ حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی سب فروعی اختلافات کے آئینہ دار فرقے ہیں۔ لیکن سب ایک دوسرے کو مسلمان ہی سمجھتے ہیں۔

۳۔ فتویٰ تکفیر کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ ہے کہ مسلمانوں کے جملہ فرقے کسی ایک شخص یا فرقہ کو گمراہ بدعتی یا کافر قرار دیں۔ ایسا فتویٰ یقیناً اپنے اندر پورا وزن رکھتا ہے۔ دوسری یہ کہ ایک فردِ واحد یا کوئی ایک فرقہ دوسرے تمام فرقوں کو گمراہ اور کافر قرار دے دے۔ جیسے مرزا قادیانی یا ان کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فرقہ دوسرے تمام مسلمانوں کے متعلق ایسا عقیدہ رکھتا اور فتویٰ لگاتا ہے تو ایسا فتویٰ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ بلکہ کافر یا گمراہ کہنے والا فرقہ خود ہی کافر یا گمراہ ہوتا ہے۔

امت کے اکثر فرقوں کا فیصلہ بالعموم صحت پر مبنی ہوتا ہے اور ہونا بھی چاہیے۔ لہٰذا سر سید کے خلاف امت کا اکثریتی فتویٰ ہی اس بات کی دلیل ہے کہ صاحب موصوف اسلام کے اصولی عقائد و نظریات پر حملہ آور ہوئے تھے۔ اور اس بات کی بھی کہ اس گئے گزرے دورِ انحطاط میں بھی مسلمانوں کی اکثریت کو مادی ترقی کے بجائے اصولِ دین کی حفاظت عزیز تر ہے۔

مفکرین قرآن کے مخصوص نظریات کا خلاصہ:

پیشتر اس کے کہ ہم سید صاحب کے اپنے مخصوص نظریات کا جائزہ لیں، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیکھ لیا جائے کہ وہ معتزلہ کے مخصوص عقائد و نظریات سے کس حد تک متاثر تھے، ہم بتلا چکے ہیں کہ معتزلہ کے مخصوص نظریات مندرجہ ذیل امور تھے:

(۱) عقل کا تفوق اور برتری۔ اسی بنا پر وہ احادیث اور اجماع کا انکار کرتے تھے۔ اور اسی عقلی تفوق کی بنا پر وہ قرآنی آیات کی دور از کار تاویلات پر مجبور ہو جاتے تھے۔

(۲) ذات و صفاتِ باری تعالیٰ میں امتِ مسلمہ کے مسلّمہ عقائد سے اختلاف رکھتے تھے۔ وہ خدا کے لیے سمت مقرر کرنے یا اس کی طرف ہاتھ یا پاؤں کی نسبت کرنے کو کفر سمجھتے تھے۔ اور صفات باری تعالیٰ کو حادث سمجھتے تھے۔ اور جو صفات کو بھی قدیم تصور کرتا اُسے مشرک قرار دیتے تھے۔

(۳) جبر و قدر کے معاملہ میں وہ قدریہ عقائد کے قائل تھے۔ وہ کہتے تھے کہ خدا کائنات اور قوانینِ قدرت بنانے کی حد تک مختار تھا۔ اب جبکہ اس نے قوانینِ قدرت بنا دیئے ہیں، تو اب وہ خود بھی اپنے وعدہ کے مطابق" ان کا خلاف نہیں کر سکتا۔ لہٰذا انہی قوانین قدرت جن میں سے ایک مکافاتِ عمل بھی ہے۔ انسان اپنے اچھے و برے کی سزا و جزا پانے پر مجبور ہے۔ لہٰذا وہ اللہ کی صفت مغفرت کی تاویل کر لیتے تھے اور شفاعت سے یکسر انکار کر دیتے تھے۔

سید صاحب کی تفسیر "القرآن" کے مطالعہ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ آپ بھی بعینہ ان نظریات میں معتزلہ کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں۔ آپ کے درج ذیل اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

(۱) **پہلا نظریہ، عقل کا تفوق:**

آپ قرآن کے الفاظ کا صحیح مفہوم متعین کرنے کے متعلق فرماتے ہیں کہ:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"ان سب باتوں کے ہونے کے بعد (وہ کیا باتیں ہیں، آگے چل کر ہم بیان کریں گے (مؤلف) اس بات کا جاننا بھی ضرور ہے کہ جس بات پر متعلق دلیل دلالت کرتی ہے۔ اس پر کوئی عقلی معارضہ تو نہیں ہے۔ کیونکہ اگر کوئی عقلی معارضہ پایا جائے گا تو ضرور نقلی دلیل پر اس کو ترجیح ہوگی اور اس نقلی دلیل کو ضرور دوسرے معنوں میں تاویل کرنا پڑے گا"

(تفسیر القرآن ج ا ص ۱/۹)

اقتباس بالا میں آپ نے کس قدر وضاحت سے اعتراف فرما لیا ہے، کہ اگر قرآن کی کوئی بات عقل کے خلاف معلوم ہو تو لامحالہ اس کی تاویل کرنا چاہیے۔ یہی وہ بات ہے کہ جو معتزلہ اور جہمیہ سے لے کر آج تک تمام منکرین قرآن میں پائی ہے۔ پھر اگلا مرحلہ یہ درپیش ہوتا ہے کہ عقلمندوں کی عقلیں بھی مختلف ہوتی ہیں۔ مثلاً جہمیہ کی عقل کا تقاضا یہ تھا کہ انسان مجبور محض ہے۔ جبکہ معتزلہ کی عقل کے مطابق انسان مختار مطلق ہے۔ اس طرح دوسرے کئی مسائل میں ان عقلمندوں کا اختلاف ہو جاتا ہے۔ جن کی تفصیل آگے آئے گی۔

(۲) دوسرا نظریہ، ذات و صفات باری تعالیٰ کی تنزیہہ :

اس سلسلہ میں سرسید صاحب کی اقتباس بالا کے ساتھ ہی ملحقہ عبارت ملاحظہ فرمائیے جو عقل کے خلاف انھیں معلوم ہوئی :

"مثلاً یہ جو خدا کا قول ہے "الرحمٰن علی العرش استویٰ"۔ یہ صاف دلالت کرتا ہے کہ خدا تخت پر بیٹھا ہوا ہے مگر دلیل عقلی اس کی معارض ہے اور خدا کا تخت پر بیٹھا ہوا ہونا عقلی دلیل سے محال ہے۔ اس لیے اس نقلی دلیل کی غلبہ یا بادشاہت سے تاویل کی گئی، اور اگر یوں نہ کیا جائے تو اجتماع نقضیین یا ارتفاعِ نقضیین لازم آتا ہے۔ اور اگر دلیل نقلی کو عقل پر ترجیح دیں تو فرع سے اصل کا ابطال لازم آتا ہے۔ کیونکہ جو چیزیں نقلی ہیں اُن کا اثبات بھی بجز عقل کے اور کسی طرح ممکن نہیں۔ پس نقل کے لیے بھی عقل ہی اصل ہے"

(ایضاً ص ۱۱۹)

——— کچھ سمجھے آپ کہ یہ اصل اور فرع اور عقل اور نقل کی کیا فلاسفی بیان ہو رہی ہے؛ بات یہ ہے کہ قرآنِ کریم کی کئی آیات سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر متمکن ہے ——— اور آیت "الرحمٰن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

علی العرش استویٰ کی تائید میں دوسری آیت اس طرح ہے :

"ان ربکم اللہ الذی خلق السمٰوٰت والارض فی ستۃ ایام ثم استویٰ علی العرش" (الاعراف : ۵۴)

"بلاشبہ تمہارا پروردگار وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا۔ پھر عرش پر قرار پکڑا۔"

اب اگر استویٰ کے معنے غلبہ یا بادشاہت لئے جائیں۔ اور موجودہ دور کے قرآنی مفکر جناب پرویز صاحب کے مطابق اس آیت کے معنے یہ سمجھے جائیں کہ "پھر خدا تخت حکومت پر متمکن ہوا"۔ تو پھر اس پر عقلی اعتراض وارد ہوتا ہے کہ کیا زمین و آسمان کی پیدائش سے پہلے خدا کا غلبہ یا حکومت یا بادشاہت نہ تھی؟ اگر ایک عقلی اعتراض سے بچنے کے لیے ایسی تاویل کی جائے۔ جس پر اس جیسا یا اس سے بھی دوسرا عقلی اعتراض وارد ہو سکے، ایسی تاویل کا فائدہ کیا ہوا؟

یہ ہیں عقل کے ناجائز استعمال کے کرشمے! دراصل فلاسفروں کی عقل کو وحی سے برتر ثابت کرنے کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔ قرآن نے بڑی وضاحت سے یہ بات سمجھا دی ہے کہ ذات وصفات باری کو سمجھنا انسان کی عقل کے احاطہ سے ماوراء ہے۔ لہٰذا بہتر طریق وہی ہے کہ وحی کے الفاظ پر ایمان لایا جائے اور اس کی تاویل سے اجتناب کیا جائے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے لا تضربوا للہ الامثال کہہ کر اس بات سے منع کر دیا ہے۔ اور جمہور ائمۂ اسلام کا یہی مذہب ہے کہ خدا تعالیٰ عرش پر موجود ہے۔ یہ سب باتیں کیسے ہیں؟ یہ ہم نہ سمجھ سکتے ہیں، نہ اس کے مکلف ہیں۔

(۳) تیسرا نظریہ، جبر و قدر :

اس مسئلہ میں سید صاحب نہ جبریہ سے اتفاق کرتے ہیں نہ قدریہ سے۔ اور نہ ہی عام مسلمانوں سے جو بین الجبر والاختیار کے قائل ہیں۔ آپ نے اس مسئلہ کو چھیڑ کر لاینحل ہی چھوڑ دیا ہے۔ تینوں سابقہ نظریات کا تذکرہ ضرور کیا ہے۔ لیکن کسی ایک کی بھی تائید نہیں کی اور نہ ہی اپنا کوئی واضح نظریہ پیش کیا ہے۔ تاہم اس طویل بحث سے جو تفسیر القرآن ج اص ہم اسے ۹ تک پھیلی ہوئی ہے۔ یہ ضرور معلوم ہوجاتا ہے کہ آپ جبر کی طرف مائل ہیں اور آپ نے جمہور ائمۂ اسلام سے اختلاف کے حق کو ضائع نہیں کیا۔

اور موجودہ وقت کے مفکر قرآن نے کتاب التقدیر لکھ کر یہ وضاحت فرما دی ہے کہ وہ اس مسئلہ میں معتزلین کے ہمنوا ہیں۔

پھر سید صاحب کے دور میں قرآنی مفکرین کے نظریات میں مندرجہ ذیل دو نظریات کا اضافہ ہوا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۴) چوتھا نظریہ، خوارق عادت اور معجزات سے انکار:

سر سید مرحوم نے ہر اس بات کو جو قوانینِ فطرت کے خلاف ہو یا مافوق الفطرت ہو، تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ آپ کا درج ذیل اقتباس آپ کے تین نظریات ــــ عقل کا تفوق، ذات و صفات باری تعالیٰ میں امت سے اختلاف اور خوارق عادت سے انکار ــــ کی پوری طرح وضاحت کر رہا ہے:

"یہ بات دیکھنی لازم ہے کہ جو معنی اس لفظ کے قرار دیئے گئے ہیں، اس کا کوئی عقلی معارضہ بھی ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو وہ معنی اس کے صحیح ہوں گے.... مثلاً خدا کے عرش پر استوا ہونے میں، اُس کے ہاتھ اور منہ اور ساق ہونے میں اور مثل اُن کے اور بہت سے لفظوں کے اصلی معنی اس لیے نہیں لیے گئے کہ دلیل عقلی اس کے خلاف تھی۔ پس کوئی وجہ نہیں ہے کہ اور الفاظ کے ایسے معنی جو دلیل عقلی سے محال ہیں یا خود اس قانونِ فطرت کے مخالف ہیں، جو خدا نے بیان کیا ہے، یا تجربہ کے مخالف ہیں، چھوڑ کر دوسرے معنی نہ لیے جائیں۔" (تفسیر القرآن - دیباچہ ص ۱۵)

اور صرف معجزات سے انکار کے متعلق بھی آپ کا نقطۂ نظر ملاحظہ فرمایئے:

"قرآنِ مجید کے معانی بیان کرنے میں سب سے زیادہ دھوکا انسان کو ان مقامات پر پڑتا ہے جہاں قرآن میں قصص انبیائے سابقین بیان ہوئے ہیں۔ انبیائے سابقین کے قصے عہد عتیق کی کتابوں (تورات) میں بھی آئے ہیں۔ اور علمائے یہود نے بھی قصص انبیاء مستقل کتابوں میں لکھے ہیں۔ جن میں بہت کچھ باتیں دور از عقل و خلافِ قانونِ قدرت درج ہیں۔ وہ قصے مشہور تھے اور ہمارے علماء بھی اُن سے مانوس تھے اور اُن کے عجائبات کو جو قانونِ قدرت کے خلاف تھے معجزات قرار دیتے تھے۔ وہ قصے قرآن میں بھی بیان ہوئے ہیں۔ اور وہ بیان بہت کچھ اس کے مشابہ اور مماثل ہے جو اِن معنوں کی نسبت بیان ہوا ہے۔ مگر قرآن مجید کے الفاظ ان قصوں میں اس طرح آئے ہیں کہ اُن سے وہ باتیں جو دور از عقل اور خلافِ قانونِ قدرت اِن قصوں میں مشہور تھیں، ان کا ثبوت نہیں ہوتا۔ ہمارے علمائے متقدمین نے اس بات پر خیال نہیں کیا بلکہ ان سے جہاں تک ہو سکا، قرآن مجید کے الفاظ کو اُن پر بعینہٖ عمل کرنے کی کوشش کی اور اُس کے کئی سبب تھے:

اوّل: یہ کہ ان قصوں کی نسبت کیفیت مشہورہ اُن کے دل میں بسی ہوئی تھی۔ اس لئے قرآن مجید کے الفاظ پر انھوں نے توجہ نہیں کی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دوسرے یہ کہ ان کے پاس ہر ایک چیز گو کہ وہ کیسی ہی قانون فطرت کے خلاف کیوں نہ ہو خدا کی قدرت عام (یعنی اِنّ اللّٰہ علی کل شیٔ قدیر (مؤلف) کے تحت میں داخل کر دینے کا نہایت سہل طریقہ تھا۔ اور اس سبب سے ان الفاظ کی حیثیت پر غور کرنے کو توجہ مائل نہ ہوتی تھی۔

تیسرے یہ کہ اُن کے زمانہ میں نیچرل سینسز نے ترقی نہیں کی تھی۔ اور کوئی چیز ان کو قانون فطرت کی رجوع کرنے والی اور ان کی غلطیوں سے متنبہ کرنے والی نہ تھی۔ پس یہ اسباب اور مثل ان کے اور بہت سے اسباب ایسے تھے کہ ان (صحابہؓ) کی کافی توجہ قرآن مجید کے ان الفاظ کی طرف نہیں ہوئی؟" (ایضاً۔ ص ۱۷)

اس اقتباس سے درج ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے:

(۱) انبیاء کرامؑ کے معجزات تورات میں بھی مذکور ہیں۔

(۲) علمائے یہود انھیں معروف معنوں میں معجزات ہی تسلیم کرتے رہے ہیں۔

(۳) علمائے یہود میں ان معجزات کی مشہوری کی وجہ سے مسلمانوں نے بھی ان خوارق عادت واقعات کو تسلیم کر لیا۔

(۴) قرآن مجید کا بیان بھی توریت کے بہت کچھ مشابہ اور مماثل ہے۔ لیکن قرآن میں الفاظ کچھ اس طرح آئے ہیں کہ ان سے دوسرے معنیٰ بھی لیے جا سکتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر خوارق عادت واقعات کو من وعن تسلیم کر لینا غلط تھا تو قرآن نے ایسے گول مول، الفاظ کیوں استعمال کیے کہ یہ غلطی بدستور مسلمانوں میں بھی منتقل ہوتی چلی گئی۔ افکار فاسدہ کی درستی ہی کتاب اللہ کا کام ہے۔ پھر سید صاحب کو علمائے کرام اور صحابہؓ پر یہ بھی افسوس ہے کہ انھوں نے نہ قانونِ فطرت کا خیال کیا نہ نیچرل سینسز کا، بلکہ خدا کی قدرت کاملہ کا عقیدہ رکھ کر قرآن کو فی الواقعہ معجزات ہی تسلیم کر لیا حالانکہ انھیں چاہیے تھا کہ وہ قرآن کے الفاظ کے دوسرے معنی تلاش کر کے ان واقعات کو مطابق قانونِ فطرت بنا دیتے۔ جیسا کہ آپ نے یہ کوشش فرمائی ہے۔ اور مثال کے طور پر چند معجزات کو مطابق قانونِ فطرت کر دکھلایا ہے۔ فرماتے ہیں:

"مثلاً ان کے زمانہ میں یہ مسئلہ ثابت نہیں ہوا تھا کہ طوفانِ نوح کا تمام دنیا میں عام ہونا اور پانی کا اونچے سے اونچے پہاڑوں کی چوٹیوں سے بلند ہو جانا محالات سے ہے اور خلاف واقع ہے اور اس سبب سے ان کے خیال میں بات نہ آئی کہ قرآن میں جو الارض کا لفظ ہے۔ اس میں

© rasailojaraid.com

الف لام استغراق کا نہیں ہے بلکہ عہد کا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے قصے میں کوئی نص صریح اس بات پر نہیں کہ اُنھیں درحقیقت آگ میں ڈالا گیا تھا۔ اسی طرح حضرت مسیحؑ کی ولادت میں کوئی نص صریح قرآن میں نہیں ہے کہ وہ فی الحقیقت بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے، نہ ہی حضرت یونسؑ کے قصہ میں ایسی کوئی نص ہے کہ فی الواقعہ ان کو مچھلی نگل گئی اور وہ مچھلی کے پیٹ میں رہے تھے۔" (تفسیر القرآن۔ دیباچہ ص ۱۷)

اس اقتباس سے درج ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے:

(۱) معجزات کے بارے میں جو نصوصِ صریحہ قرآن میں موجود ہیں۔ وہ قطعاً نصوصِ صریحہ نہیں بلکہ محتاجِ تاویل ہیں۔ اور

(۲) اُن کی جو تاویل پیش کی جائے گی وہ بھی قابلِ اعتماد نہیں ہو سکتی۔ جیسا کہ آپ خود ہی لکھتے ہیں کہ:

"اور کیا عجب کہ آئندہ زمانہ میں ان علوم کو اور زیادہ ترقی ہو اور جو امور اس وقت محققہ معلوم ہوتے ہیں وہ غلط ثابت ہوتے ہوں۔ اس وقت قرآنِ کریم کے الفاظ کے دوسرے معنی قرار دینے کی ضرورت ہوگی وھلم جرا۔ پس قرآن لوگوں کے ہاتھ میں ایک کھلونا ہو جائے گا۔" (ایضاً ص ۱۹)

پھر اس کا جواب یوں بیان فرماتے ہیں کہ:

"پس اگر ہمارے علوم کو آئندہ زمانہ میں ایسی ترقی ہو جائے کہ اس وقت کے امورِ محققہ کی غلطی ثابت ہو تو ہم پھر قرآن مجید پر رجوع کریں گے اور اس کو منزل درحقیقت کے مطابق پائیں گے۔ اور ہم کو معلوم ہوگا کہ جو معنی ہم نے پہلے قرار دیئے تھے تو وہ ہمارے علم کا نقصان تھا۔ قرآن مجید ہر ایک نقصان سے بری تھا۔" (ایضاً۔ ص ۲۰)

اس جواب میں مندرجہ ذیل نتائج اخذ ہوتے ہیں:

۱۔ جو غلطی سابقہ مفسرین سے ہوئی کہ موجودہ علوم کا لحاظ رکھے بغیر قرآن کی تفسیر کی وہی غلطی آپ بھی کر رہے ہیں۔ کیونکہ آئندہ علوم آپ کی تاویل کو غلط ثابت کر سکتے ہیں۔

۲۔ سابقہ مفسرین کی تفسیر کی تائید تورات، علمائے یہود کی تصانیف اور قرآن کے ظاہری مفہوم سے ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ سرسید کی تاویل سے بدرجہا زیادہ قابلِ اعتماد ہے۔ کیونکہ سید صاحب کی تاویل کو کسی چیز کی بھی تائید حاصل نہیں۔ مزید یہ کہ اس تاویل کو وہ خود بھی ناقابلِ اعتماد سمجھتے ہیں۔ کیونکہ ان کی تاویل کے ماخذ دورِ جاہلیت کی لغت کے متروک اور غیر مشہور معانی اور پھر ان سے حسبِ خواہش

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

استبعاد ہے۔

پھر معجزات کی ایسی تاویل کے جواز میں آپ ایک مثال بیان کرتے ہیں:

"مثلاً فرض کرو کہ قرآن مجید سے ہم نے یہ سمجھا تھا کہ سورج زمین کے گرد پھرتا ہے۔ جس سے طلوع و غروب ہوتا ہے۔ اب معلوم ہوا کہ سورج ساکن ہے اور زمین سورج کے گرد پھرتی ہے۔ اب ہم قرآن پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سورج کا پھرنا قرآن میں بطورِ حقیقت کے واقع نہیں ہوا بلکہ علیٰ ما یشہدہ الناس بیان ہوا ہے۔ اور وہ سچ ہے۔ پس ہم نے جو اس کو بطورِ حقیقت واقع کے سمجھا تھا وہ ہماری غلطی تھی نہ کہ قرآن مجید کی"

(ایضاً ص ۲۰)

اس مثال میں بھی کئی ایک مغالطے اور الجھاؤ ہیں۔ مثلاً:

(۱) بات انبیاءؑ کے معجزات کی چل رہی ہے اور مثال آپ اجرام فلکی سے پیش فرما رہے ہیں۔

(۲) قرآنِ کریم کے الفاظ سے قطعاً یہ ثابت نہیں ہوتا کہ سورج زمین کے گرد گھوم رہا ہے۔ قرآن کے الفاظ یہ ہیں:

"والشمس تجری لمستقر لها" "سورج اپنی قرارگاہ پر چل رہا ہے"

اور اس سے مراد اس کی مجوزہ گردش بھی ہو سکتی ہے۔ اور اپنے خاندان سمیت کسی بڑے سیارہ کے گرد گردش بھی۔ جیسا کہ موجودہ نظریات اس کی تائید کر رہے ہیں۔ اس آیت سے زمین یا سورج میں سے کسی ایک کے سکون یا حرکت پر کوئی دلیل نہیں لائی جا سکتی۔

(۳) اجرام فلکی کی رفتار کی تحقیق انسان کی عقل کا میدان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائے آفرینش سے آج تک ان کے متعلق چار نظریات پیش کئے جا چکے ہیں۔ جن کی تفصیل ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔ مزید یہ کہ آئندہ بھی اس میں تبدیلی کا امکان ہے۔ اس کے برعکس انبیاءؑ کے معجزات گزشتہ دور کے واقعات اور انسان کے دائرۂ تحقیق سے خارج ہیں۔ ان کے متعلق دو ہی نظریے ہو سکتے ہیں۔ اقرار یا انکار۔ چنانچہ تمام مذہبی طبقے ان معجزات کو صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ جبکہ نیچر پرست یا مادہ پرست لوگ ان معجزات سے انکار کر دیتے ہیں۔

نگہ بازگشت:

پچھلے ہر دو ابواب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ:

• اسلامی تاریخ میں جن لوگوں نے سب سے پہلے اصولِ دین میں اختلاف کیا وہ جہمیہ اور معتزلہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھے۔ یہ دونوں فرقے دوسری صدی کی پیداوار ہیں۔ اور ان دونوں فرقوں کا یہ اختلاف یونانی فلسفہ سے ذہنی شکست خوردگی کی بنا پر تھا۔

۲۔ اِن دونوں فرقوں کا اختلاف تین اصولی مسائل میں تھا۔

(ا) دونوں فرقے ذات و صفاتِ باری تعالیٰ میں ارسطو کے ہم نوا تھے۔ جو خدا کو محض ایک تجریدی تصور کے طور پر پیش کرتا ہے۔

(ب) دونوں فرقے وحی کے مقابلہ میں عقل کے تفوق اور برتری کے قائل تھے۔ گو وہ زبان صوفیہ کی طرح یہی کہتے تھے کہ وہ وحی کا مقام عقل سے بلند سمجھتے ہیں، لیکن عملی طور پر وہ قرآن کی ہر ایسی آیت کی نئی تاویل پیش کرتے تھے جو ان کے نظریات سے متصادم تھی۔ انھوں نے عقل کی برتری ثابت کرنے کے لیے قرآن سے ایسی جملہ آیات کو یکجا کر کے پیش کر دیا جن میں انسانی عقل کو مخاطب کیا گیا ہے اور اس کا دائرہ کار ہے لیکن وحی کی برتری، حکمت اور اتباع کی آیات کو نظر انداز کر دیا۔

۳۔ دونوں فرقوں نے تقدیر کے مسئلہ میں مسلمانوں کے مسلمہ عقیدہ سے اختلاف کیا، جو یہ ہے کہ ایمان جبر و اختیار کے بین بین ہے۔ لیکن اس مسئلہ میں ان دونوں فرقوں کے درمیان بھی اختلاف تھا۔ جہمیہ انسان کو مجبورِ محض تصور کرتے تھے اور معتزلہ انسان کو مختارِ کل۔

۴۔ اپنے عقائد و نظریات کو درست ثابت کرنے کے لیے اُن کا طریقِ کار یکساں تھا۔ یعنی:

(ا) پہلے متعلقہ احادیث و آثار کو ظنی اور ناقابلِ اعتماد قرار دے کر ان سے انکار کر دیا جائے۔

(ب) دوسرا اقدام یہ تھا کہ ثابت شدہ سنّت کو بھی سند اور صحت کے مقام سے گرا دیا جائے۔ اور اس کے لیے عقلی دلائل دیئے جائیں۔

(ج) تیسرا اقدام یہ تھا کہ احادیث و آثار کو پرے ہٹا دینے کے بعد قرآنی آیات کی من مانی تاویل پیش کر دی جائے۔

گویا عجمی تصورات سے مرعوبیت، انکارِ حدیث اور تحریفِ قرآن تینوں باہم آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔

۵۔ جو احادیث جہمیہ نے مسئلہ قدر کے معاملہ میں رد کیں۔ وہی احادیث معتزلہ کے نزدیک صحیح ترین تھیں۔ اسی طرح جو احادیث معتزلہ کے نزدیک مردود تھیں وہی احادیث جہمیہ کے نزدیک مقبول ترین تھیں۔ یہی حال ان دونوں فرقوں کی تاویلات قرآنی کا ہے۔ ان حقائق سے یہ نتیجہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لازمی طور پر سامنے آتا ہے کہ جب کوئی انسان یا فرقہ کسی عجمی تصور کا غلام بن جاتا ہے تو قرآن و سنت دونوں کو بازیچۂ اطفال بنا دیتا ہے اور بزعم خویش ایسی قرآنی تاویلات کو قرآنی فکر کا نام دیتا ہے۔

۶۔ ہندوستان میں اس "عقلیت پرستی" (RATIONALISM) کی نشأۃ ثانیہ سر سید مرحوم سے شروع ہوتی ہے۔ آپ مغربی تہذیب اور فلسفہ سے سخت متاثر تھے۔ آپ نے مغرب کی فطرت پرستی (NATURALISM) اور ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کو ذہنی طور پر قبول کر لیا۔ پھر انھیں اسلامی نقطہ نگاہ سے صحیح ثابت کرنے کے لیے وہی تکنیک استعمال کی جو جہمیہ اور معتزلہ نے کی تھی یعنی:

(ا) احادیث کو ناقابل اعتماد قرار دینے کے بعد قرآن کی ان تمام آیات کی تاویلات پیش کر دیں جن میں انبیائے کرام کے معجزات کا ذکر تھا۔

(ب) نظریۂ ارتقاء پر "ایمان" نے آپ کو نبوت، وحی، ملائکہ، آدم، ابلیس یا شیطان کے متعلق نئی تاویل و تعبیر پر آمادہ کیا۔ اور ان کے متعلق آپ نے امتِ مسلمہ کے مسلّمہ تصورات و عقائد کو یکسر بدل ڈالنے کی کوشش کی۔

۷۔ جس طرح انکارِ حدیث اور تاویلِ قرآن لازم و ملزوم ہیں۔ بعینہٖ اسی طرح عجمی تصورات اور عقلیت پرستی بھی لازم و ملزوم ہیں۔ عقلیت پرستی ہی ایک ایسی قدرِ مشترک ہے۔ جو ان تمام افراد اور فرقوں میں پائی جاتی ہے۔ جبکہ دوسرے مسائل میں ان کا آپس میں اختلاف ممکن ہے۔

تاویلات کی مجبوری:

(۱) دراصل سید صاحب کی مجبوری یہ ہے کہ ایک طرف تو وہ قرآن سے بھی منسلک رہنا چاہتے ہیں اور دوسری طرف نظریۂ ارتقاء پر ایمان لا چکے ہیں۔ نظریہ ارتقاء پر تفصیلی بحث تو ہم آگے چل کر کریں گے، سردست یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ اس نظریہ کی رو سے انسان یا تو بندر کی اولاد ہے۔ یا کم از کم بندر کی نوع سے ہے اب قرآن کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے آدم کو اپنے ہاتھ سے بنایا۔ پھر اس میں اپنی روح پھونکی، جس سے اس میں عقل و شعور پیدا ہوا۔

(۲) فرشتوں کو سجدہ کا حکم دیا، سب فرشتوں نے سجدہ کیا لیکن ابلیس نے انکار کیا۔ کیونکہ جنوں سے تھا اس کی طبیعت میں سرکشی تھی۔ وہ اپنے آپ کو آدم سے اس لحاظ سے برتر سمجھتا تھا کہ اس کی تخلیق آگ سے ہوئی ہے جو طبعاً اوپر کو اٹھتی ہے۔ اور آدم کی تخلیق مٹی سے ہوئی ہے جو طبعاً نیچے گرتی ہے۔

(۳) آدم ہی وہ نفس واحدہ ہے جس سے اس کی بیوی کی تخلیق ہوئی۔ پھر اس جوڑے سے تمام بنی نوع انسان پھیلے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۴) اللہ تعالیٰ نے آدمؑ اور اُس کی بیوی کو جنت میں آباد کیا، لیکن ابلیس جو نافرمانی کی وجہ سے راندۂ بارگاہِ الٰہی بن چکا تھا۔ آدم اور حوا سے انتقام لینا چاہا۔ اُس نے دونوں کو خدا کی نافرمانی پر آمادہ کیا اور بالآخر انھیں پھسلانے میں کامیاب ہوگیا۔ جس شجرِ ممنوعہ کے چکھنے سے انھیں منع کیا گیا وہ انھوں نے چکھا تو اُن کی شرمگاہیں ظاہر ہوگئیں۔ پھر وہ جنت کے پتوں سے اپنے بدن کو ڈھانپنے لگے شیطان نے انھیں یہ پٹی پڑھائی تھی کہ میں تمھیں ایسے درخت کا پتہ بتلاتا ہوں جس کے چکھنے سے تمھیں ہمیشہ کی جنت نصیب ہو جائے گی۔ جہاں نہ کھانے پینے کی فکر ہوگی نہ رہنے سہنے کا غم۔

(۵) آدمؑ کو اُس کی غلطی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان تینوں کو جنت سے نکل جانے کا حکم دیا کیونکہ یہ ایک دوسرے کے دشمن تھے۔

یہ ہیں قرآنِ کریم کے الفاظ جو متعدد مقاماتِ قرآن میں مذکور ہیں۔ اب اس تعلیم کی رُو سے آدمؑ کو ایک فردِ واحد۔ ابوالبشر اور نبی تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح فرشتوں اور ابلیس کے الگ اور خارجی وجود کو بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ لیکن نظریۂ ارتقاء کی رو سے آدم نہ تو فردِ واحد قرار دیا جا سکتا ہے۔ نہ ہی یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ بندر کی نسل جو چلی آرہی تھی اور مابعد انسانوں میں تبدیل ہوئی تو نفخِ رُوحِ خداوندی کا واقعہ زندگی کے کس موڑ پر پیش آیا۔ اور کس معین ہستی میں یہ روحِ خداوندی پھونکی گئی؟ دورانِ ارتقاء نسلِ انسانی فرشتے کہاں سے ٹپک پڑے تھے۔ ابلیس کہاں سے نووارد ہو گیا۔ اور یہ باتیں ایسی تھیں جو قرآن میں مذکور تھیں۔ احادیث میں بھی موجود اور بائیبل سے بھی اُن کی تائید ہوتی تھی۔ ایسی صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کے لئے سید صاحب کی تکنیک یہ تھی کہ:

۱۔ اس سارے واقعہ کے فی الحقیقت کوئی واقعہ ہونے سے ہی انکار کر دیا۔ اور اُسے ایک تمثیلی داستان قرار دیا۔

۲۔ آدمؑ کو فردِ واحد یا نبی قرار دینے کے بجائے اس سے مراد "آدمؑ" کے بجائے "آدمی" لیا اور کہا، کہ وہ کوئی مخصوص فرد نہ تھا۔ بلکہ بنی نوع انسان کا کوئی نمائندہ (RERESENTATIVE OF MAN) تھا۔

۳۔ فرشتوں سے مراد کائناتی قوتیں لیا۔ اور اُن کے سجدہ کرنے سے مراد یہ لی گئی کہ یہ قوتیں انسان کے سامنے سجدہ ریز ہوئیں۔ گویا انسان اپنے علم و تجربہ سے ان پر حکمرانی کر سکتا ہے۔ دلیل یہ دی گئی کہ سَخَّرَ لَکُم مَّا فِی الاَرضِ جَمِیعًا۔

۴۔ (۱) آدمؑ اور اُس کی بیوی کے لیے شجرِ ممنوعہ دراصل جنسی ترغیبات تھے۔ یہی شجرۃ الخلد تھا یعنی انسان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اپنی اولاد کے ذریعہ بقائے دوام چاہتا تھا۔

(ب) شجرِ ممنوعہ کے معنی دراصل لفظ شجر میں پوشیدہ ہیں۔ یعنی مشاجرت یا باہمی اختلاف سے منع کیا گیا تھا۔ یعنی وہ خود غرضی میں مبتلا نہ ہوں۔ اور اس طرح ایک دوسرے کے دشمن نہ بن جائیں ورنہ انھیں جنت سے نکلنا پڑے گا۔

۵۔ جنت میں صرف آدمؑ و حوا ہی نہ تھے بلکہ پوری نوعِ انسانی آباد تھی۔ کیونکہ خدا نے فرمایا ہے "اھبطوا منھا جمیعًا" یعنی صیغہ جمع غائب استعمال کیا نہ کہ تثنیہ کا۔

یہاں صرف سید صاحب کے عقائد بیان کرنا مقصود تھا۔ تفصیلی بحث آئندہ نظریۂ ارتقاء میں بیان کریں گے۔

(جاری ہے)

توجہ فرمائیے!

(۱) دفتر کے نام ایک منی آرڈر موصول ہوا ہے جس پر رقم، نام، پتہ کچھ بھی درج نہیں۔ جن صاحب نے یہ منی آرڈر ارسال فرمایا ہے مطلع فرمائیں مہربانی ہوگی۔

(۲) بعض خریدار حضرات جنھوں نے وی۔پی۔ قبول فرمالیا ہے اور اُن کو رسیلات بھی روانہ کی جارہی ہیں، اُن کے لفافے پر "آپ کا چندہ ختم ہے" کی مُہر کا یہ مطلب ہے کہ اس وی۔پی۔ کے ذریعے انھوں نے سابقہ واجبات کی ادائیگی فرمائی ہے۔

یہ حضرات آئندہ کے لیے وی۔پی۔ روانگی کی اجازت مرحمت فرمائیں۔

شکریہ —! منیجر

ؔ۱ یہی قصہ ابلیس و آدم، پرویز صاحب نے ایک مستقل کتاب لکھ کر بڑی شرح و بسط سے پیش کیا ہے۔ لہٰذا یہاں سے بیشتر حوالہ جات اسی کتاب سے دیئے جائیں گے۔

© rasailojaraid.com